ماسی، کسی بڑی عمر کی عورت کو پکارنے کا بے تکلف طریقہ ہے۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ اس کے بڈھے شوہر کی رعایت سے لوگ اسے کمسنی ہی میں آنٹی پکارنے لگے تھے اور یہ روایت سی بن گئی تھی، اس کا عمر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چھوٹے بڑے رشتہ دار، دوست، سب اسے آنٹی ہی بلاتے تھے۔ لطیف صاحب کو البتہ لوگ مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔

بھائی صاحب، چچا جی، تایا، بڑے ابا، دادا، سبھی نام ان کی مٹی خراب کرنے کو کافی تھے کیونکہ لطیف صاحب کا چہرہ وقت بریدہ مصری ممی کی طرح تھا۔ جلد ایسی نیلی، مائل سبز تھی کہ شبہ ہوتا سانپ کاٹے کا علاج تو کروا چکے ہیں پر سانپ کے زہر کا اثر رگوں میں موجود ہے ویسے بھی ماتھے پر بھنوری تھی۔ ابرو گھنے اور ناک کی سیدھ میلوں تھے۔ اس بھونڈی شکل و صورت پر بات کرنے کا ڈھب کبھی نہ آیا۔ سچ بولتے تو لگتا جھوٹ بول رہے ہیں۔ جھوٹ بولنے کی کوشش کرتے تو محسوس ہوتا کہ جھوٹ بھی سلیقے سے بولنے کا طور نہیں جانتے۔

لیکن شائستہ آنٹی کا چراغ اللہ کے تیل سے جلتا تھا۔ بھری جوانی میں تو وہ پلکیں اٹھانے جھکانے سے ہی بھونچال اٹھا سکتی تھی۔ اب بھی خدا اُن پر بہت مہربان تھا۔ دو جوان بیٹیوں کی ماں تو وہ کبھی لگتی ہی نہیں تھیں لطیف سے دو قدم پر وہ ان کی بیوی بھی نظر نہ آتیں۔ دل چاہتا کہ وہ گوندنی کی طرح زیور سے لد لدا کر تخت پوش پر بیٹھی رہیں اور تمام ایرے غیرے مور چھل جھلتے رہیں۔ لوگوں کا دل ہی مورتی پوجن پر آمادہ نہ رہتا تھا بلکہ خود جگت آنٹی کا خیال تھا کہ یہ تعریف، پوجا، پرستش کسی نو بہار نوخاستہ کا حق نہیں بلکہ ان کی میراث ہے۔

لیکن یہ تب کی بات ہے جب انہیں دنیا کی اہم ترین خبر نہیں ملی تھی۔

صبح جب درزی نے دو خوبصورت جوڑے لاکر دیے تو وہ بالکل نارمل محسوس کر رہی تھیں۔ اسے کسی قسم کا گُتا گھاس چٹا ہوا نہ تھا۔ دو چوڑی دار پاجاموں کے ساتھ گھیر دار حیدر آبادی قمیص اور سوا تین گز کے جھل جھل کرتے چمکتے دوپٹے تھے۔ ان جوڑوں کو دیکھتے ہی اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ کون سا وہ ڈنر پر پہنے گی اور کون سا لنچ پر؟ ان کے ساتھ زیور کا چناؤ اور خوشبو تک

کی پسند وہ دل میں کر چکی تھی۔

خبر پہنچنے سے پہلے اس نے کپڑے ٹرائی کرنے کے لیے سبزی مائل نیلا چوڑی دار پاجامہ پہنا، کھلی قمیص کو احتیاط سے تن پر ڈالا اور جگ مگ جگ مگ دوپٹہ اوڑھ کر بڑے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پتہ نہیں کیوں پہلی بار اس کی خوش اعتمادی کو ٹھیس لگی۔ اسے شک گزرا کہ اس کی پنڈلیاں کچھ زیادہ بھاری ہو چکی ہیں۔ کولہے پہلے کی طرح سڈول نہیں رہے اور وہ امراؤ جان ادا لگنے کی بجائے میراثن بھانی کی طرح سب طرف سے کھائی کھیلی نظر آ رہی ہے اس لمحے اسے اپنے آپ پر، آئینے پر اور سب سے زیادہ درزی پر غصہ آیا۔ یہ کم بخت درزی بڑا سٹرکی ہے۔ نوجوان لڑکیوں کے کپڑے توجہ سے سیتا ہے اور ــــ یہ خیال چند ثانیے رہا ــــ پھر بوڑھے افسر کی طرح اس نے اپنے ماضی کے ریکارڈ پر نازاں ہو کر یہ خیال دل سے نکال دیا کہ ابھی پانی سر سے نہیں گزرا ۔ جو عورت تیس سال سے اونچی سوسائٹی میں سیکس سمبل کا رول ادا کر رہی ہو، اسے اتنی چھوٹی سی بات کیونکر ہلا سکتی تھی؟

لیکن اسی وقت کہیں سے وہ بھاری مونچھوں اور نمی نمی مسکراہٹ والا سیلز آفیسر آدھمکا اور ساتھ ہی دنیا کی اہم ترین خبر ملی ــــ اور وہ بھی بذریعہ تار ــــ اس کی دونوں جواں سال بہویں شام کی فلائٹ سے امریکہ سے سیدھی پہنچ رہی ہیں۔

دو سدھائی ہوئی بچار سو چالیس وولٹ کی بجلیاں!

اس نے سیلز آفیسر کو مرعوب کرنے کے لیے رات کو ڈنر دے رکھا تھا لیکن رات سے پہلے تو اس کی دونوں بہویں شاور لے کر، تازہ دم اعلیٰ لباس میں سینٹ کی بوتلوں کی طرح آراستہ پارٹی میں موجود ہوں گی ــــ اسے معلوم تھا کہ فاران دل پھینک تھا اور اس کی بہویں گو گھر اجاڑنے کی حد تک فلرٹ نہیں تھیں لیکن نظر بھاڑنے، حرکتِ قلب بڑھانے اور زہر کھانے کے خواب جگانے تک ضرور لے جاتی تھیں۔

وہ سارے شہر کی فیشن ایبل عورتوں کی خانہ ساز تھی۔ اس کا مشورہ مفت اور بے مثال ہوتا

لیکن اب تار سامنے پڑا تھا۔ ایک سبز ی مائل چوڑی دار پاجامہ اس کی ٹانگوں پر بندوق کے غلاف کی طرح چڑھا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ رات کے ڈنر پر اس کا بنے گا کیا؟ وہ ان امریکہ پلٹ بہوؤں سے کیسے نپٹے گی؟ حملہ آور کی خبر مل گئی تھی لیکن سدباب کا کوئی ہنر اسے کارگر ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

ایک تو اس کے دونوں بیٹے لطیف صاحب پر گئے تھے۔ بس ان میں بھی باپ کی اکلوتی خوبی تھی۔ یہ یا وہ اس جس چیز کو چھو لیتے سونے کی بن جاتی لیکن کسی عورت کے دل کو پا چھنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ امریکہ میں سٹور پر سٹور کھولتے جا رہے تھے ـــــ ریڈی میڈ کپڑے، چمڑے کی جیکٹیں، بوتیک کا مال، تو لیے کا ویئر دھڑا دھڑ امپورٹ کر رہے تھے۔ اسی رفتار سے بیچ رہے تھے اور ان کی بیویاں رمضانیوں ـــــ کی طرح کبھی کبھی ان کی حضوری میں ہوتی تھیں۔ ورنہ کبھی بیروت کبھی کیلیفورنیا ـــــ کبھی ہوائی ـــــ جہاں جاتیں اکٹھی دونالی بندوق کی طرح ـــــ ان کے قصے جب تک پاکستان پہنچتے وہ کسی اور شہر میں پہنچ چکی ہوتیں ـــــ جگت آنٹی کو اپنے نیم گنجے بیٹوں پر بہت غصہ آتا لیکن کیا کرتیں۔ اتنے فاصلے سے تو ماتا کا داؤ بھی نہ چلتا تھا۔ تین سال پہلے وہ شائستہ کے ساتھ رہتی تھیں لیکن تب وہ ہر پارٹی میں ان کو مات دے چکی تھیں۔ اب ان اڑن سانپوں کی شہرت بہت سریع التاثیر ہو گئی تھی۔ ان کی بڑی بہو روزی اور چھوٹی بہو انیلا دونوں زہر ہلاہل تھیں۔ بڑی کا رنگ اگر دبتا تھا تو اس کا جسم اس قدر سڈول تھا کہ اجنتا کی غاروں میں بنے ہوئے پدمنی روپ جسم اس کے سامنے شرمسار ہو جاتے۔ بیٹھتی چلتی اٹھتی اسے دیکھ دیکھ کر جی نہ بھرتا۔ چھوٹی انیلا گول گول گیشا گرل تھی۔ گول کلائیاں، گول بازو، گول دہن ـــــ گول کولہے، گول کمر اور گول گول بانہیں۔ قد اس کا دراز نہ تھا لیکن رنگت چاہی گلاب سے مشابہ تھی۔ شبہ ہوتا کہ چہرے پہ شفق کی کبھی کبھی سرخی ہے لیکن دل گواہی دیتا کہ سب میک اپ کا کرشمہ ہے۔

مصیبت ان شوں شاں بہوؤں کی نہ تھی۔ بکھیڑا تو سارا افاران کا تھا! پتہ نہیں وہ کس وقت

آنٹی کے دل میں سما گیا تھا اور رہ جاتی تھا۔ نہ درزی کپڑے خراب سی کر لاتا نہ ٹرائی کے وقت وہ پہنچتا نہ اسی وقت کلوہیوں کا ٹیکس پہنچتا اور نہ ہی آنٹی کو اس شورے کی پتلی کو اپنے داؤ پیچ تبدیل کرنے کا خیال آتا ـــــ نہ ہی وہ اس قدر جلد ایل بی ڈبلیو ہو جاتی۔

دیمک ایک دن میں نہیں لگتی ـــــ عمارت ہمیشہ اینٹ اینٹ گرتی ہے ـــــ اور قومیں قدم قدم برباد ہوتی ہیں۔ شاید پہلا پتھر اس روز گرا جس روز مسز سبحانی کے گھر کافی پارٹی تھی۔ کافی پارٹی، اچھلی میٹنگ اور وی سی آر پر فلم دن چڑھے کے وقت کٹی کا عام پروگرام تھا۔ اس وقت بھی پارٹی کی خواتین اَن گنت اچھی خوشبوؤں میں بسی موجود عورتوں کی تعریفیں اور عدم موجود خواتین کی نکتہ چینیوں میں گھلے دل سے شریک تھیں ـــــ وی سی آر پر فلم چل رہی تھی لیکن اسے بھی سب کم نگاہی سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی اصل توجہ ایک دوسرے کے کپڑے زیور اور مسز سبحانی کے ڈرائنگ روم کے سامانِ آرائش پر تھی۔

اس روز آنٹی شائستہ حسبِ معمول لیٹ داخل ہوئی ـــــ آنٹی کو معلوم تھا کہ لیٹ پہنچنے میں کیسے وہ سب سے تر و تازہ اور نمایاں نظر آتی ہے ـــــ ہمیشہ کی طرح تہلکہ خیز، روح پرور اور تیقن بھری ـــــ آنٹی کو معلوم تھا کہ وہ کس وقت، کیسے اور کس کس پر کیسے ایفکٹ کرتی ہے

اس روز بھی یہ ایمونیا گیس آئی اور ایک صوفے میں جا کر یوں بیٹھی جیسے رومن عہد کی ملکہ ہو۔ اس نے بصد تکلف اپنا نیم عریاں بازو ترد و سے صوفہ کی پشت پر رکھا اور انگلیاں ڈھیلی چھوڑیں پرانی ملاقاتیں اور اجنبی نو واردیں سب کی سب اس کی انگوٹھیوں میں گم ہو گئیں۔ بیٹھتے وقت سینے میں کساوٹ اور گریبان میں لٹکنے والے لاکٹ میں تو مچلنے کی کیفیت پیدا ہو ہی گئی تھی لیکن جب اس نے گھٹنے پر گھٹنا دھرا اور گنبد کو فوم کی گدی پر ٹکایا تو اس کے بیٹھنے میں ایک ماہر کلاکار کا نزت شامل ہو گیا۔ اب تک شائستہ اتنی نظروں کو متاثر کر چکی تھی کہ ایک اچھے کمپیئر کی طرح اسے معلوم تھا کہ اس کی کون سی ادا کس شخص پر، کس حد تک اثر انداز ہو رہی ہے؟

"بھئی ہمیں ان لڑکیوں سے انٹروڈیوس کراؤ مسز بسمانی ——" خود اعتمادی کے ساتھ بڑی لاڈ بھری آواز میں آنٹی بولی۔ لڑکیوں کا لفظ اس نے محض تکلف کے طور پہ استعمال کیا تھا ورنہ اپنے سوا وہ کسی کو لڑکی ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اسے لگتا تھا کہ لڑکیاں عام طور پہ برسات دیدہ پھلجھڑیاں ہوتی ہیں۔

"یہ میری بھانجیاں ہیں۔ ہوم اکنامکس سوشل سائنس والا کالج ہے نا! وہاں پڑھتی ہیں دونوں ان کو بہت شوق تھا ہماری کافی پارٹی کا —— میں نے کہا تم بھی آجانا بھئی —— میری سہیلیوں سے ملنا ——"

آنٹی نے ابرو اٹھایا اور مربیانہ انداز میں مسکرائی۔

"دراصل جی۔ ہم دونوں کو ٹھیک طرح سے پتہ نہیں تھا کہ پارٹی کس دن ہے۔ یہ کہتی تھی کہ فرائی ڈے کو ہے۔ میں کہتی تھی کہ ٹیوز ڈے کو —— اسی گھپلے کی وجہ سے ہم دونوں تو کالج یونیفارم میں آگئیں"۔ سانولی لڑکی بولی۔

"اور یہاں آکر پتہ چلا کہ پارٹی پیر کے روز ہے ——" آنٹی نے خوشی، سچائی اور شوق سے عاری قہقہہ لگایا۔ ایسے قہقہوں پر انہیں ایک مدت سے داد مل رہی تھی۔

دوسری گھگھی نے لحظہ بھر کو حیران ہو کر آنٹی کو دیکھا۔ پھر کہنے لگی:

"ہم دونوں تو اتنی امپریس ہوئی ہیں —— اتنی امپریس ہوئی ہیں کہ ہماری آواز ہی نہیں نکلتی ——"

اب شائستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سفید شیفون کا آنچل اس کے بازو پر لٹکا تھا۔ وہ ڈھلے ڈھلائے جسم کو فیشن پریڈ کی طرح پیش کرتے ہوئے نمایاں آواز میں بولی:

"اچھا لڑکیو! گیس کرو میری ایج کیا ہے؟"

وہ یہ گیس کئی پارٹیوں میں کئی لوگوں سے لگوا چکی تھی لیکن یا تو کوئی بھی اس کی صحیح عمر جانچ نہیں سکا تھا یا جانچ کر اس کے اظہار کے قابل نہ تھا۔ اس کی آنکھوں کے اردگرد کوے کے پنجوں

جیسی لکیریں ضرور پڑ چکی تھیں اور دہن بھی لکیر دار ہو چکا تھا لیکن یہ دونوں تبدیلیاں میک اپ کی معمولی تہ سے چھپ جاتی تھیں۔

سامنے کھڑی یونیفارم میں ملبوس لڑکیوں نے آنٹی پر نظر ڈالی۔ پھر ایک دوسری کو ٹٹولا اور پھر اپنے بھانویں برِ صغیر ایشیا روس میں باکو تیل کا کنواں دریافت کر لیا۔ گھگھی نے اپنا سستا سا کلپ درست کرتے ہوئے کہا:

"قریباً ففٹی ایئرز آنٹی ــــ"

"ففٹی ــ اور ففٹی فور ــــ اس کے درمیان کہیں ــــ" سانولی بولی۔

بجگت آنٹی پر نیوٹران بم گرا۔ اس کا جسم تو باقی رہا لیکن روح، شوخی، احساسِ زندگی سب کچھ قابلِ ذکر پرواز کر گیا ــــ یہ تو آنٹی کی سوشل آنکھ مچولی تھی۔ وہ نئے ملاقاتیوں کو اپنی عمر کے متعلق دبی دبی شیخی اور کھلی کھلی مسکراہٹ کے ساتھ گپیں ضرور کرواتی تھی لیکن آج تک کسی نے انہیں پینتیس سے زیادہ کا نہ بتایا تھا۔

آنٹی اس حجاب کے بعد کھڑی ضرور تھیں لیکن اگر اس وقت ان پہ ایک شکر خورے کا پَر بھی آ گرتا تو وہ منہ کے بل گرتیں۔

"کیوں آنٹی! ٹھیک ہے نا ہمارا اندازہ ــــ"

"بالکل بالکل ــــ اور کیا۔ اس سال میں ترپن کی ہو جاؤں گی اکتوبر میں ــــ"

پتہ نہیں یہ کوئی مذاق تھا؟ ــــ کسی قسم کی جیت تھی یا پھر عورتیں کسی پرانے حساب کو برابر کر رہی تھیں، بڑے زور کی تالی بجی اور اس سے بھی اونچا قہقہہ بلند ہوا۔

تاج محل کی یہ پہلی اینٹ گری۔

اس واقعہ کے عین تیسرے دن وہ اپنے بڈھے گنجے گدلی آنکھوں والے شوہر کے ساتھ شہر کے ایک معروف بزنس مین کے گھر ڈنر پر گئی۔ لطیف صاحب آنٹی سے بمشکل دو تین سال بڑے تھے لیکن پھپھوندی کھائی ڈبل روٹی کی طرح ان کا رنگ ہر ابر نیلا تھا۔ چہرے پر ایک بے رونقی تھی

چونکہ بزنس اتنی لمبی چوڑی اور وقت کو کھا جانے والی تھی کہ فلرٹ کرنے کا وقت بھی نہ ملتا تھا۔ اس نیچرل ٹانک سے محروم ہو کر وہ مردم کم اور چیپز زیادہ نظر آتے تھے۔ ادھر آنٹی ان کے ساتھ جوانی کا سمبل تھیں۔ ان کی معیت میں اپنی روح بچانے بچاتے بھی لطیف صاحب بہت زیادہ بے جان ہو چکے تھے۔

ڈنر پہ شہر کے معززین کا اجتماع تھا۔ دو تین ریٹائرڈ ایکٹریسیں بھی آئی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر پروڈیوسروں اور پبلک کی عقل پر رونا آتا تھا جنہوں نے ان نا آفریں صورتوں کو پردہ سکرین سے اتار کر محفلوں کی جان بنا دیا تھا۔ کچھ جدید سوسائٹی گرلز خواتین تھیں لیکن ساری محفل میں شائستہ بیگم کے جوڑ کی کوئی عورت نہ تھی۔ اس کا لباس سفید، آواز میں قدرتی لاڈ، اداؤں میں مشتق دیدہ لگاوٹ، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کے انداز میں مہارت آمیز کشش تھی۔ اس نے اس دنیا میں پورے ترپن سال گزارے تھے لیکن کسی سال کی خزاں کا اس پر بوجھ نہ پڑا تھا۔

شائستہ اپنی پلیٹ پر تھوڑا سا سلاد، روسٹ کی ہوئی مچھلی کا قتلہ اور تھوڑی وائٹ ساس ڈالے پنسل ہیل پر ڈگمگ ڈولتی بوفے ڈنر کے مہمانوں سے مل رہی تھی ـــــ کبھی اس ٹکڑی میں کبھی اُس گروپ میں۔ اس کی پلیٹ بھرنے کے لیے شہر کے معزز افسر ڈونگے اٹھائے پھر رہے تھے۔ اسے ٹیشو پیش کرنے کے عمل میں ملک التجار گنے کا ڈبہ نذرانہ بنائے پیچھے پیچھے گھوم رہے تھے۔ پانی اور ڈرنکز کے گلاس ملک کے نامور ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں تھے ـــــ ادیب شاعر انوکھے واقعات کا خوانچہ لگائے اس کے منتظر تھے۔ ان مشتاق نظروں نے جیسے مل کر ایک مکڑی کا جال بنایا جس میں شائستہ بیگم بڑی شائستگی سے پھنس گئی۔

آج تک اس نے کبھی کسی ایسے شخص سے بات نہ کی تھی جس سے اس کا باضابطہ تعارف نہ ہوا ہو۔ اس معاملے میں وہ پوری انگریز تھی۔ گھنی ملائم بازوؤں والے صوفوں پر اجنبی لوگوں کے ساتھ بیٹھی رہتی لیکن کچھ ایسی سرد مہری سے کہ اگر تعارف نہ ہوتا تو رسمی سلام کی نوبت بھی نہ آتی۔ اجنبیوں کی محفل میں وہ پہروں لپ سٹک سے اپنی ناک میں پڑی ہوئی ڈائمنڈ کی تیلی کو

دیکھ کر گزار سکتی تھی لیکن کبھی کبھی اپنے ہی قدموں میں غلط راستوں کے نشانات ہوتے ہیں یہاں بڑے ہال کے پہلو میں وہ بیٹھا تھا۔ اگر وہ انٹروڈیوس ہونے کا انتظار کرتی تو شاید بڑی گھڑی ٹل جاتی لیکن دھوئیں بھرے کمرے سے نکل کر آوازوں کے جنگل سے باہر آ کر یک دم وہ بہت اداس ہو گئی۔ پھر کچھ باتیں کچھ واقعات ہمیشہ فضا میں ہوتے ہیں اور اچانک ٹھاہ کر کے ماتھے میں آ لگتے ہیں جیسے آدمی کرکٹ گراؤنڈ کے قریب بیٹھا ہو اور کسی لمحے کسی وقت کرکٹ کا بال منہ پر آ لگے۔

دراصل شائستہ بیگم کو اپنی ساڑھی کے پلو درست کرنے تھے۔ ابھی وہ پیٹی کوٹ کے اندر انگلیاں ڈال کر سفید ساڑھی کو جمانے ہی والی تھی کہ اس کی نظر سامنے پڑی اور جھٹ بغیر تعارف کے اس کے منہ سے نکلا:

"ہیلو ــــ!"

وہ موٹی موٹی مستطیل سی عینکیں لگائے ناک میں انگلی پھیرتا اکونومسٹ رسالہ پڑھ رہا تھا یکدم اس کی بھی چوری پکڑی گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بے ساختگی سے بولا:

"ہیلو جی ــــ ہیلو ــــ!"

"بھئی سب اندر انجوائے کر رہے ہیں تم یہاں کیوں بیٹھے ہو ــــ چلو اندر"۔

شائستہ میں ڈھلی عمر نے ایک اور خوبی پیدا کر دی تھی۔ جوانی میں جو باتیں وہ لہجہ شرما کر منوایا کرتی تھی اب ان میں دھونس، رعب اور ماں جیسا لاڈ پیدا ہو گیا تھا۔

"جی میں گیسٹ نہیں ہوں۔ میں تو ایک کام کی غرض سے آیا ہوں"۔

شائستہ نے ایک قاتلانہ نظر نوجوان پر ڈالی۔ وہ عمر میں چھبیس سے زیادہ نہ تھا چہرے پہ حسن سے زیادہ ایک عجیب قسم کا غنڈہ پن تھا۔ ساتھ ساتھ ہونٹوں کے اردگرد کچھ حیا کے باقی ماندہ نشان بھی تھے۔ شائستہ کچھ اچھی طرح سے فیصلہ نہ کر پائی کہ یہ نوجوان عاشقوں کے قبیل سے ہے کہ محبوبوں کے قبیلے سے ــــ شاید اس میں دونوں خوبیاں جڑواں ساتھ ساتھ

تھیں۔ بہرکیف شائستہ نے اپنے اندازے کو وثوق تک پہنچانے کے لیے تھوڑی سی مہلت اور چاہی اور اسی وقفے میں وہ کرکٹر اس کے دل میں اتر گیا۔ اس نے اپنی پلیٹ اس نوجوان کو پکڑا کر کہا:

"آؤ میرے ساتھ! تم میرے گیسٹ ہو۔ آؤ"

یہ کہہ کر بغیر سوچے سمجھے شائستہ آگے چل پڑی اور اس کے پیچھے وہ نوجوان ایسے چلنے لگا جیسے تنگ جوتے پہن کر آیا ہو۔

"جی۔ میں تو مرزا جی سے کچھ کاغذات اٹیسٹ کروانے آیا ہوں"۔

"ارے وہ بھی ہو جائیں گے ـــــ چلو آؤ ـــــ"

کبھی کبھی بہت کمزور غیر اہم فیصلوں میں آئندہ کے بہت اہم فیصلے چھپے ہوتے ہیں۔ گویا کوئی بادشاہ کسی سانولی اجنبی آنکھوں والی کنیز کو ایک مرتبہ مسکرا کر اپنے قریب بلانے کا کیا مرتکب ہوتا ہے کہ اسی چھوٹے سے واقعے میں سے چلتا چلاتا کہیں اس کا تخت و تاج بھی چھن جاتا ہے اور اس کے اپنے بیٹے جو دست بستہ اس کے حضور کھڑے رہتے تھے بادشاہ سلامت کو جلاوطن کر کے پھر اس کی راجدھانی کو بھی جوتے میں ہار دیتے ہیں۔

پہلی معمولی ہار میں آخری خوفناک شکست سر کے بال کھولے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہوتی ہے ـــــ وقت آنے پر اٹھتی ہے اور قیامت برپا کر دیتی ہے۔

وہ دونوں بڑے ہال نما ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے جہاں کٹ گلاس کے بڑے بڑے شمعدان دیواروں میں لگے ہوئے آئینوں میں اپنا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"مرزا جی ـــــ میں تو اس ینگ مین کو ساتھ لے آئی ہوں۔ فار گاڈ سیک اسے کچھ کھلائیں اتنے لعنتی نہ بنیں ـــــ"

شائستہ نے ایک بڑی پلیٹ میں خود ہی کانٹا اور نیپکن رکھ کر اسے پیش کر دیا۔ جونہی آنٹی اس کی پیٹرن بن گئی سارے مجمعے کو اس کی شمولیت پر کوئی اعتراض نہ رہا۔ وہ دونوں کھانا ڈال کر

دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ بڑی دیر کے بعد آنٹی کو زندگی میں مزہ آنے لگا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مرزا صاحب کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع دیا۔"

اس نے بغیر کسی شکر گزاری یا حلم کے کہا —— "میں تو دراصل ایک سفارش کے لیے آیا تھا۔"

'نوکری کیا ہے؟ میری سفارش کافی نہ رہے گی۔'

'اگر مرزا صاحب کچھ حرف ٹیلی فون پر کہہ دیں تو کام بن سکتا ہے۔ ایک فریجیڈائر ریفریجریٹر فیکٹری میں کام ہے سیلز آفیسر کا۔'

'اب اس فکر کو نکال دو —— اور شاباش میرے لیے جا کر گاجر کا حلوہ ڈال کر لاؤ۔'

'ضرور آنٹی ضرور۔'

آج تک لڑکے لڑکیاں اسے آنٹی ضرور کہتے تھے لیکن اس آنٹی لفظ کے کوئی معنی نہ تھے۔ پہلی ملاقات میں اس قدر گھل کر کبھی کسی نے اسے آنٹی نہ پکارا تھا —— وہ یکدم کسی ریلوے کے باتھ روم میں اپنے چہرے کے بجائے کسی بڑھیا کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی —— اور پھر سیلز آفیسر کو دیکھتی چلی گئی۔

وہ اپنے ایک ہاتھ سے کالر ٹھیک کرتا، دوسری ہتھیلی پر آنٹی کی پلیٹ جمانے میں مشغول، لوگوں میں جگہ بناتا میٹھے پکوانوں کی طرف بڑھ گیا —— اونچی سوسائٹی کے مرد دولت کمانے میں اس حد تک کام آ چکے تھے کہ اب ان میں خوبصورت کپڑوں کے علاوہ ایسی کوئی بات نہ رہی تھی جس پر مرد کا لیبل لگایا جا سکتا —— اس ساری مردجاتی میں یہ سیلز آفیسر بذاتِ خود ایک ٹرافی تھا اور آنٹی کی نظریں اس پر جمی تھیں۔

جس وقت نوجوان پلیٹ میں جیلی فروٹ کریم اور حلوہ لے کر لوٹا آنٹی ابھی تک کڑاہی سے اترے سٹیک کی طرح تڑتڑ کر رہی تھی۔ اس نے پلیٹ پکڑ کر اپنے پرانے آزمودہ چتون بنائے اور پوچھا:

'اچھا آنٹی تو تم نے مجھے بنا لیا۔ اب بتاؤ اس ساری محفل میں تمہارا ا نگل کون ہے؟'

نوجوان اپنی خالی پلیٹ دوبارہ بھرنے کے لیے جانا چاہتا تھا۔ اس کے انداز میں جلدی تھی اس نے سارے لوگوں پر نظر پھیر کر اس کے گنجے، گدلی آنکھوں والے بڈھے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا:

"جی وہ بیٹھے ہیں نیلی بش شرٹ والے جو ٹانگ ہلا رہے ہیں مسلسل"۔

"تم انہیں جانتے ہو ——"

وہ بے دھیان کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے پلیٹ میں کونٹی نینٹل کھانا ڈالنا چاہیے کہ پاکستانی ——؟

"نہیں جی ——" اس نے ایک خوبصورت لڑکی پر ٹکٹکی جما کر کہا۔

"ضرور تمہیں معلوم ہوگا کہ میں ان کی بیوی ہوں —— لطیف صاحب کی ——"

"جی نہیں —— میں نے پہلی بار آپ دونوں کی زیارت کی ہے"۔

"یہ نہیں ہو سکتا —— یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بھلا تم نے یہ گیس لگایا کیسے —— میں تو ان کی بیوی لگتی ہی نہیں ——"

"میرا خیال ہے جی ایسے شادی شدہ جوڑے جو پچیس سال ایک ساتھ گزار چکے ہوں ان کی شکلیں، طریقے، ٹیسٹ —— سب کچھ ملنے لگتا ہے"۔

شائستہ ایکسکیوزمی کہہ کر صوفے میں جا دھنسی —— پتہ نہیں کیوں، زندگی پھر کڑوی کسیلی ہو چکی تھی۔

آج تک کسی نے اسے اپنے شوہر کی بیوی نہ سمجھا تھا۔ جب تک کوئی تعارف نہ کراتا پتہ ہی نہ لگتا تھا کہ وہ اس جیلی فش کی ملکیت ہے۔ بہت سی برف ڈلوا کر شائستہ نے غٹا غٹ پانی کا پورا گلاس پیا لیکن غصہ اس کے سر کی طرف چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ٹھنڈے ہاتھ پاؤں گرم ہو گئے تھے اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل کر اس کی شکل کو خیر انسانی بنانے میں مصروف تھیں۔

وہ تو اس سیلز آفیسر کے کبھی ہاتھ نہ لگتی لیکن دوسری صبح جب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے

سامنے بیٹھی چہرے پر آئل آف اولے کی مالش کر رہی تھی کہ اس کے مونچھوں والے بیرے نے اطلاع دی کہ ایک صاحب ملنے آئے ہیں۔

"کیا نام ہے — ؟"

"جناب یہ کارڈ —" بیرے نے کمر میں خم ڈال کر چاندی کی ٹرے آگے بڑھا دی۔

چھوٹے سے کارڈ پر ترچھے حروف میں فاران سعید لکھا تھا اور نیچے سیدھے ٹائپ میں ایم اے برکلے کی ڈگری درج تھی پہلے تو شائستہ کا دل چاہا کہ انکار کر دے لیکن پھر پہلے قدم میں ہی آخری قدم کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کیا بے چارے کو نوکری نہیں ملی۔ ذرا سی نازک مزاجی سے اُس کا کام بگڑ جائے گا۔

وہ ارادہ ہی لے کر گئی تھی کہ گھنٹی ساڑھے بیٹھی رہے گی اور ایسی سرد مہری سے پیش آئے گی کہ فاران کو اس راج درشن کا دوبارہ حوصلہ ہی نہ ہو گا لیکن جس وقت وہ اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اسے لگا فاران سعید رات سے گھٹ کر آدھا رہ گیا ہے۔ ماتا اور محبت اکٹھی عود کر آئیں۔

"اوہ جی سلام علیکم۔ معاف کیجیے میں نے صبح صبح آپ کو زحمت دی۔ دراصل نوکری کا تو اتنا مسئلہ نہیں تھا لیکن میں آپ سے اس قدر اس قدر امپریس ہوا رات کہ ساری رات سوچتا ہی رہا — آپ ڈنر سے اتنی جلدی کیوں لوٹ آئیں ؟ — بھلا؟"

اس نے آخری سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس طرح آؤٹ ناں۔" شائستہ نے دل میں سوچا۔ راج رانی کے پاس کوئی گورے لٹھے کی طرح اکڑا اکڑا انفورڈی جاتا ہے۔

"کیسے آئے ؟"

"بس جی آنا پڑا —"

یہ سوال شائستہ نے ملاقات کے تیسرے گھنٹے تک کوئی دس مرتبہ پوچھا لیکن ان تین گھنٹوں میں ایک بار بھی فاران نے نوکری کی بات نہ کی۔ بالآخر ہار کر اسی نے یہ ٹاپک کھولا اور وعدہ کیا کہ وہ

اس کی سفارش کرے گی۔ فاران اُن مردوں میں تھا جو بن کہے اپنی منوا لیتے ہیں۔
پہلے وہ نوکری کی سفارش کے سلسلے میں آتا رہا۔ پھر نوکری کا شکریہ ادا کرنے کبھی بالوشاہی کبھی لڈو ڈوں کے ڈبے لانے لگا۔ ہر بار مٹھائی اس کے ضرور ساتھ ہوتی اور وہ نوکری کا ہی شکریہ ادا کرتا رہتا۔

پہلے پہل تو ثنائستہ کو لگا کہ فاران اس کے دبدبے میں آگیا ہے لیکن آہستہ آہستہ اسے محسوس ہونے لگا کہ فاران اس رنواس کا مالک ہو گیا ہے۔ پہلے اسے شبہ ہوا کہ وہ عاشقوں کی قبیل سے ہے لیکن اب رفتہ رفتہ اسے احساس ہو چلا تھا کہ یہ کہنہ مشق محبوب قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ فاران کو جنسِ مخالف میں بڑی دلچسپی تھی لیکن اپنا لوہا منوانے تک ـــــ وہ اسی حد تک توجہ دیتا تھا جب تک سامنے والا ہار نہ مان جائے۔

ابھی ہفتہ بھر پہلے آنٹی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ فاران کو لطیف صاحب کی موجودگی میں اپنے دونوں بیٹوں کی تصویریں دکھا رہی تھی۔ بار بار فاران کے ہاتھوں کو چھونے کا یہ چھوٹا سا داؤ تھا۔

"یہ میرا بڑا بیٹا احمد ہے اور یہ ہے چھوٹا علی ـــــ دونوں امریکہ میں ہیں۔ بڑا کاروبار پھیلا لیا ہے ـــــ اور یہ ان کی بیویاں ہیں روزی اور انیلا ـــــ"

روزی اور انیلا کی تصویریں فاران کے ہاتھ میں تھیں۔ لطیف صاحب صوفے میں بیٹھے کھلی آنکھوں سو رہے تھے اور تصویروں نے فاران کی آنکھوں میں نئی امیدیں جگا دی تھیں۔

اس نے ایک آنکھ میچ کر آنٹی کی طرف دیکھا ـــــ اور پھر آہستہ سے بولا:

"پتہ نہیں۔ میں ان دونوں میں سے کس کے لیے گروں گا ـــــ دونوں اچھی ہیں"۔

بات معمولی تھی۔ ثنائستہ کے سوشل سرکل میں فلرٹ کرنے سے نیچرل ٹانک کا کام لیا جاتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں وہ اندر سے ڈانواں ڈول ہو گئی ـــــ واقعی دونوں اچھی ہیں اور لوگوں کو گرانے کا فن جانتی تھیں۔

پھر آج صبح جب ٹیلکس ملی کہ اس کی بہوئیں روزی اور انیلا شام کو پہنچ رہی ہیں تو وہ شام کے

کپڑے ٹرائی کر رہی تھی۔ اسی وقت فاران آگیا۔ رات کا ڈنر اس نے دل ہی دل میں فاران کو اپنے قدموں میں گرانے کے لیے کیا تھا پر اب وہ دونوں چٹکیوں میں اڑانے والی آ رہی تھیں ـــــ اس کا موڈ آف تھا جب وہ چوڑی دار پاجامے، حیدرآبادی قمیص اور تین گز لمبے دوپٹے میں فاران سے ملی۔

"اتنا بڑا ڈنر ہے اور شام کو روزی اور انیلا بھی آ رہی ہیں ـــــ تین تو منسٹر آ رہے ہیں۔ میں انہیں کیسے ریسیو کرنے جاؤں گی ایئرپورٹ؟"

"آپ فکر نہ کریں ـــــ میں چلا جاؤں گا ـــــ اگر میں ان کو لے کر غائب ہو گیا تو ـــــ"

"تم کہاں جاؤ گے ـــــ چھوڑو ـــــ اتنی اٹریکٹو نہیں ہیں ـــــ"

"آپ نے تیاری کر لی ڈنر کی ـــــ؟"

"ہاں۔ لباس تو منتخب کر لیا ہے لیکن زیور ابھی طے نہیں ہوا ـــــ دیکھو میرا خیال ہے کہ میں اپنی ساس کی جیولری آج پہنوں گی ـــــ"

شام کو جب وہ حیدرآبادی لباس پہنے اپنی ساس کا زیور پلنگ پر پھیلائے سوچنے میں مشغول تھی کہ اسے دنیا کی ایک اور بدترین خبر ملی ـــــ فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پیچھے بیرا ریسیو کرے گا لیکن آخر وہ زیوروں کو چھوڑ کر فون کے پاس پہنچی۔

"السلام علیکم! ـــــ"

"وعلیکم السلام فاران ـــــ بھئی کہاں ہو۔ آدھے گھنٹے میں پہنچو ـــــ بہت سے کام ہیں!"

فاران تھوڑا سا کھانسا۔ پھر بولا۔ "میں تو ایئرپورٹ پر ہوں آنٹی ـ آپ نے کہا تھا ناں کہ آپ روزی اور انیلا کو ریسیو کرنے نہیں آ سکتیں۔ فلائٹ کچھ لیٹ ہو گئی ہے۔ بہرکیف ڈنر سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں ـــــ"

آنٹی کو یقین ہو گیا کہ واقعی اب فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں سے جانے کس زمانے کا سیلاب بند توڑ کر نکلا۔ وہ اپنی ساس کے زیوروں کو آہستہ آہستہ ڈبوں میں بند کرنے لگی۔ پھر اس کی نظر مروارید کی ایک تسبیح اور چند الائچی دانوں پر پڑی ـــــ اس نے تسبیح پلنگ پر پڑی

رہنے دی۔ حیدر آبادی لباس اتارا اور آیا کے لیے فون کیا:

"دیکھو زینب! یہ دونوں جوڑے نیچے جاکر روزی اور انیلا بی بی کے کمرے میں رکھ دو۔۔۔ ان کا میرا ناپ ایک ہی ہے۔ جب وہ ایئر پورٹ سے آئیں تو انہیں بتا دینا کہ میں نے خاص اس ڈنر کے لیے بنوائے ہیں ـــ یہ لباس پہن کر وہ تیار ہو جائیں ـــ باقی فاران ان کو سمجھا دیں گے۔"

جس وقت کمالِ احتیاط سے زینب جوڑے اٹھائے رخصت ہونے لگی تو شائستہ نے اسے پھر آواز دی:

"سنو زینب! لطیف صاحب کو بتا دینا روزی اور انیلا ہوسٹ ہوں گی۔ میں ڈنر پر نہیں آؤں گی۔ ان کو بتا دینا یہ میرے وظیفے کا وقت ہے ـــ"

زینب نے آج تک بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں تسبیح نہیں دیکھی تھی۔

"اور اگر جی صاحب نے حکم دیا بلانے کا ـــ"

"دروازہ بند کر دو ـــ کوئی اللہ کی درگاہ سے بھی بلایا جا سکتا ہے۔ روزی بی بی اور انیلا بی بی کو بتا دینا کہ میں انہیں صبح ملوں گی ـــ مجھے ملنے کا حکم نہیں ہے۔"

دروازہ اندر سے مقفل کر کے وہ جائے نماز پر بیٹھ گئی ـــ

زندگی کے ترپن سال اس نے خزاں کے احساس کے بغیر کاٹے تھے۔ جب سے فاران اس کی زندگی میں آیا تھا اسے خزاں کا احساس ہونے لگا تھا ـــ یکدم مروارید کی تسبیح پر اس کے آنسو گرے تو اسے عجیب قسم کی راحت محسوس ہونے لگی۔ اسے لگا کہ اس میدان میں اس کی بہوئیں اسے مات نہ دے سکیں گی ـــ اس کھیل کی ابھی وہ بھیدی نہ ہوئی تھیں ـــ آہستہ آہستہ بغیر کچھ پڑھے تسبیح کے دانے گر رہے تھے۔ منہ ہل رہا تھا ـــ وہ جانتی تھی کہ روزی اور انیلا ابھی یہاں تک نہ آ سکیں گی۔

آنسو اس کی تسبیح پر گرتے جا رہے تھے اور نیچے مہمانوں کی آمد کا شور شروع ہو گیا تھا!

حسن خاتمہ

اسے پکاڈلی تک ہی تو جانا تھا۔

لیکن ہیمر سمتھ سے پکاڈلی تک کا راستہ اسے زندگی سے بھی لمبا لگ رہا تھا۔ آج وہ ٹھیک بتیس سال اور بتیس دن کی ہو گئی تھی اور یہ کچھ ایسی لمبی عمر بھی نہیں لیکن فائزہ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کئی صدیوں سے زندہ ہے اور جیتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اس کے تو نسل بھی تیار ہو چکے ہیں لیکن زندگی ختم ہونے میں نہیں آتی۔

ہیمر سمتھ بھی عجیب نام تھا۔ لوہار کا ہتھوڑا۔ اگر پاکستان میں کسی جگہ کا نام لوہار کا ہتھوڑا ہوتا تو اس نام پر کتنی شرم آتی۔ پھر اس سٹیشن سے آگے شیپرڈ بش تھا، چرواہے کی جھاڑی! یہ نام اردو میں بدلتے ہی کتنے چیپ، اجڈ اور ان کلچرڈ لگنے لگتے۔ سب سے پہلے لندن میں مستقل طور پر منتقل ہونے پر اسے اپنے لباس اور زبان پر ہی تو اعتراض ہوا تھا۔ یہ کیا، دو ٹانگوں والی شلوار، چاکوں والی قمیض، اوپر سے دوپٹے کا بھی دم چھلا۔ آدمی کتنا غیر مہذب لگتا ہے ایسے لباس میں — اوپر سے سلام علیکم سلام علیکم۔۔۔۔!

انگریزی میں جونہی گڈ مارننگ کہیں دل بشاش سا ہو جاتا ہے، مسکراہٹ چہرے پر آجاتی ہے۔ فائزہ سوچنے لگی اچھا ہی کیا عرب والوں نے کہ اب ٹیلی وژن پر سلام علیکم کی

بجائے مصباح الخیر کہتے ہیں۔ سلام علیکم کہتے تو کتنے اولڈ فیشنڈ لگتے۔

فائزہ ہیر سمتھ کے سب وے میں داخل ہوئی اور جینز کی جیب میں سے دس دس پینی کے چار سکے نکال کر اس نے سلاٹ مشین میں ڈالے۔ مشین کے پیٹ میں سے زرد رنگ کی چالیس پینی کی ٹکٹ برآمد ہو گئی۔ وہ سب وے کے کھلے سٹیشن پر پکاڈلی جانے والی ٹرین کے انتظار میں ایک بنچ پر بیٹھ کر تلی ہوئی مونگ پھلی کھانے لگی۔ یہ مونگ پھلی کا پیکٹ وہ اپنے ابا جی کی دکان سے لائی تھی۔

گلاب تندوری سٹورز ارلز کورٹ پر واقع تھی اور فائزہ اس میں پچھلے دس سال سے مشین کی طرح کام کر رہی تھی۔ اس دکان کے تین سیکشن تھے۔ ایک طرف کھانے پینے کی اشیا تھیں۔ جن میں طرح طرح کے بسکٹ، جیم، دودھ کے ڈبے، مکھن، ڈبل روٹی، پیتا بریڈ اور ایسی ہی اَن گنت چیزیں تھیں۔ اسی سیکشن میں ایسے کھلے کیلو منٹر بھی تھے جن میں ٹھنڈی مرغیاں اور برف آلود سبزیاں تھیں۔ اس سیکشن کی دوسری جانب تازہ سبزیوں اور پھلوں کے ریک تھے۔ ان کے پیچھے سارا دن اس کا بھائی الیکٹرک آری کے ساتھ حلال گوشت کاٹتا رہتا تھا۔ اسی کاٹ پیٹ میں ایک روز اس کے بائیں انگوٹھے کو بھی ضرب آگئی تھی اور وہ اس انگوٹھے کو قریبی ڈاکٹر سے پٹی بندھوا کر پھر گوشت کاٹنے آ کھڑا ہوا تھا۔

اس علاقے میں چونکہ عرب لوگ زیادہ رہتے تھے اس لیے سارا دن عرب خواتین اور مرد اس کی دکان سے حلال گوشت پکا پکایا ٹیک ہوم کھانا، ہندوستانی اچار، پاکستانی چاول اور پھل خریدنے آتے رہتے تھے۔ ان دونوں سیکشنوں کے علاوہ دکان کے پچھلے حصے میں شراب بکتی تھی اور دکان کے اس گپت سیکشن میں اس کا باپ بیٹھتا تھا۔ جس روز باپ کسی وجہ سے نہ آسکتا تو فائزہ اس حصے میں بیٹھتی اور اس کی چھوٹی بہن کاؤنٹر پر بیٹھ کر حساب کتاب کرتی۔ ورنہ عام دنوں میں گتے کی پاسبانی اور کیلکولیٹر پر حساب کرنا، پینی کو پینی سے جوڑ کر پاؤنڈ بنانا اور پونڈوں کی گڈیاں جوڑ توڑ کر خوش ہونا اس نے بہت جلد سیکھ لیا تھا۔

وہ پچھلے بارہ سال سے اس دکان کی دیکھ بھال میں شامل تھی۔ پاکستان میں اس نے ایف اے کیا تھا اور لندن آ کر وہ پڑھائی کرنا چاہتی تھی لیکن لندن میں صرف او لیول کرنے کے بعد اسے باپ کی دکان نے لپیٹ لیا۔ اس دکان کو وہ پاکستان میں بزنس کہتے تھے۔

پہلے جب ابا گلاب دین نے محنت مزدوری کر کے اور اماں نے ٹورسٹ بسوں میں کنڈکٹر گھوم کر پیسے جمع کیے تو ان کے تینوں بچے اس جدوجہد میں شامل نہ تھے۔ پھر ابا نے ارلز کورٹ میں بڑے ٹھکانے کی جگہ سستے داموں ایک ایسے پاکستانی سے خریدلی جو پاکستان واپس جا رہا تھا۔ اب اماں اور ابا مل کر دکان چلانے لگے۔ اماں رات کے وقت فائزہ اور حمیرا کی مدد سے بھنا ہوا گوشت، کابلی چنے، آلو مٹر، سموسے وغیرہ بناتی۔ پھر انہیں سلور ڈبوں میں بند کرتی۔ اوپر سٹیپ کے ساتھ قیمت لکھی جاتی۔ پھر سارا دن اماں دکان پر گاہکوں سے نبٹتی رہتی اور باپ مال ڈھوتا لیکن جلد ہی کام بڑھنے لگا اور باپ نے ایک رات فیصلہ کیا کہ پاکستان سے زیادہ محبت کرنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ سامنے والی دکان میں بہت سا ہندوستانی سامان بکتا تھا اور اس کی بکری خوب خوب ہوتی تھی۔ ابا نے بھی ہندوستانی اچار بڑیاں پاپڑ رکھنے شروع کر دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی دکان بھی چل نکلی۔

عربوں کے لیے حلال گوشت تو رکھا ہی جاتا تھا لیکن ابا نے محسوس کیا کہ اس گوشت کو کاٹنے اور پیکٹ بنانے کا لیبر بہت مہنگا ہے اس لیے اس نے زبیر کو کالج سے اٹھا لیا اور اس سیکشن کا مالک بنا دیا۔ لیکن ابھی تک فائزہ کاؤنٹر پر بیٹھنے نہیں آئی تھی۔ وہ اور حمیرا گھر پر رہ کر دکان کے لیے کھانے دانے تیار کرتی تھیں۔

لیکن جلد ہی ابا نے محسوس کیا کہ عربوں کے علاوہ انگریز اور امریکن اور مقامی اطالوی لیبر بھی اس کی دکان پر آتے ہیں اور حلال گوشت کے علاوہ سؤر کا گوشت بھی بک سکتا ہے۔ کچھ دیر ابا گلاب دین ہچکچاتا رہا پھر اس نے یہ کہہ کر دل کو تسلی دی کہ آخر ہم کوئی یہ گوشت کھا تھوڑی رہے ہیں۔ صرف بیچنے میں کیا حرج ہے اور پھر ہم جس ملک میں آ کے بیٹھے ہیں وہاں تو

تو ہر جگہ یہ مال بکتا ہے اور ہر چیز میں اس کی چربی پڑتی ہے۔ اس سے پہلے ابا ایسے بسکٹ کیک، پنیر، چاکلیٹ وغیرہ بھی نہ لاتا تھا جن میں سؤر کی چربی پڑی ہوتی ۔ وہ سودا لانے سے پہلے کئی کئی گھنٹے اس بات کی تفتیش میں صرف کرتا کہ جو بسکٹ کیک وہ خرید رہا ہے وہ صرف مکھن میں تیار ہوتے ہیں یا نہیں ـــــ لیکن جب ابا کو بے چارے سفید فام گاہکوں پر بہت ترس آنے لگا کہ وہ اس کی کم نظری اور دقیانوسی خیالات کی وجہ سے مایوس لوٹتے ہیں تو حلال گوشت کے علاوہ اور قسم کے گوشت بھی دکان پر بکنے لگے۔ ساتھ ساتھ دوسری اشیاء خریدتے وقت بھی ابا نے یہ پڑھنا چھوڑ دیا کہ کن کن اشیاء کے مرکب سے یہ سامان بنا ہے۔ اب گلاب دین سٹورز پر ایسے بسکٹ، کیک، پنیر ملنے لگے جن میں سؤر کی چربی کا امتزاج ہوتا۔ ابا گلاب دین کا خیال تھا کہ سؤر کا گوشت کھانا منع ہے اسے بیچنا منع نہیں ہے۔

جب گلاب سٹورز بہت مال دار ہونے لگا تو ابا کو خیال پیدا ہوا کہ دکان کے دو سکشنوں کے علاوہ تیسرا سکشن بھی ضروری ہے۔ اس سکشن میں اس کا ارادہ شراب وغیرہ رکھنے کا تھا۔ کچھ عرصہ تو اس نے اپنے بچوں اور بیوی سے یہ ارادہ چھپائے رکھا لیکن جب پچھلے سکشن میں لکڑی کے ریک اور کاؤنٹر بن گئے۔ شرابوں کے کریٹ آگئے اور سجائے گئے تو ابا گلاب دین نے محض اطلاعاً اپنے اپارٹمنٹ میں کہا کہ اب گلے پر بیٹھنے والا کوئی نہیں اس لیے فائزہ روز دکان پر بیٹھا کرے گی اور اماں اور چھوٹی حمیرا ٹیک اوے کھانا تیار اور پیک کریں گی۔

پتہ نہیں ابا گلاب دین اماں سے ڈر رہا تھا یا شاید اس کا خیال تھا کہ ایک گندمی رنگ کی بال کٹی جینز پہننے والی لڑکی بیرونی کاؤنٹر بہتر سنبھال سکتی ہے ـــــ فائزہ کو پہلے پہل تھوڑا دھکا لگا لیکن وہ جانتی تھی کہ ہر نئی تبدیلی اوّل اوّل دوسروں کو اور خود اپنے آپ کو چونکا دیتی ہے۔ اچھے ذہین لوگ وہ ہوتے ہیں جو نئے ماحول سے جلد ہی مطابقت پیدا کر لیں۔

اسی طرح جب اس نے شلوار قمیض چھوڑ کر اس لیے پتلون بلاؤز پہنی تھی کہ اتنی سردی میں دیسی لباس کام نہیں آتا۔ تب کچھ دن تک وہ گڑبڑاتی رہی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ جینز کی ایسی عادی ہوئی کہ اب شلوار قمیض پہنتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ ایسے ہی وہ تمام تبدیلیاں جو شروع میں حیران کرنے والی بدظن اور بدگمان رکھنے والی تھیں، اب معمول بن گئی تھیں لیکن گلاب سٹورز میں شراب بھی بکے گی اس کے لیے کافی دنوں تک بدحواسی، بے چینی اور منتشر کرنے کا موجب رہی۔

فائزہ کے لیے ایک مشکل تھی۔ وہ اپنی ماں کی بجائے اپنی دادی کی گود میں پلی تھی اور دادی نے اسے پرانی قدریں، اپنا چودہ سو سال پرانا مذہب اور بڑی پرانی تہذیب حوالے کی تھی۔ لندن آنے سے پہلے جب دادی نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا تو فائزہ کو بہت دکھ ہوا۔

"کیوں دادی کیوں ــــ ؟"

"اب میری آخری عمر ہے میں چاہتی ہوں میرا انجام نیک ہو ــــ حسنِ خاتمہ کی خواہش ہے میری ــــ"

"کیا مطلب ــــ آپ وہاں ہم سب کے ساتھ ہوں گی۔ وہاں انجام نیک کیوں نہ ہوگا۔"

"لباس، زبان، مذہب ــــ موسم ــــ کوئی ایک بات فرق ہو تو بتاؤں۔ وہاں تو سب کچھ ہی بدلا ہوگا ــــ میں اپنی کس کس چیز کو بچاؤں گی۔"

"آپ کا خیال ہے لندن میں نیک لوگ نہیں بستے ــــ ان کے انجام نیک نہیں ہوتے۔ . . . . ."

"لے لے لے لے۔ الٹی کھوپڑی ہے تیری فائزہ ــــ میں نے یہ سب کب کہا ہے؟ میں تو کہتی ہوں وہ جگہ فرق ہے ــــ اگر میں تیرے ساتھ گئی تو